AL-MISBAH RESEARCH JOURNAL

Al-Misbah, **Vol. 3, No. 1**(2023),157-167
https://almisbah.info/

مغربی تصورِ حقوق نسواں کے پاکستانی معاشرے پر منفی اثرات: ایک معاصرانہ تحقیقی جائزہ

NEGATIVE EFFECTS OF WESTERN CONCEPT OF FEMINISM ON PAKISTANI SOCIETY: A CONTEMPORARY RESEARCH REVIEW

*Irum Gul
**Dr. Sibghatullah Bhutto

ABSTRACT

Women's rights movements in the West have come under fire for perhaps having detrimental effects on traditional communities. Although promoting gender equality is a noble objective, others contend that Western beliefs may unintentionally fuel cultural imperialism. Western principles imposed on culturally diverse nations run the risk of undermining indigenous customs and creating resistance to change. Social tensions may arise when Western feminism's emphasis on independence conflicts with communal ideals in other countries. Moreover, the universal strategy could not tackle the distinct obstacles encountered by women throughout different regions of the globe, thereby restricting the efficacy of these campaigns. Sometimes, the Western perspective can silence regional voices and impede the creation of gender-related solutions that are sensitive to cultural differences. To make sure that the fight for women's rights does not inadvertently have detrimental effects, a more sophisticated and culturally sensitive strategy is required. In this paper, negative impacts of western concept of women right has been discussed.

Keywords: Western concepts, feminism, women rights, Pakistani culture, religious society

پس منظر

مغربی تہذیب میں خواتین کو آزادی اور مساوات کا نعرہ لگوا کر جب حکومتی و سیاسی عمل داری اور امور میں عورتوں کو شریک کیا گیا تو بمشکل چند ہزار یا لاکھ خواتین ہی اس سے استفادہ کرتے ہوئے صدر، وزیر اعظم، جج یا دیگر اعلی مناصب تک پہنچ سکیں جب کہ باقی ماندہ ان گنت خواتین ہمیشہ اس سے محروم رہیں اور ہنوز کوئی خاطر خواہ مستفید نہیں ہو سکیں۔ جب کہ دوسری طرف یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مساوات اور آزادی کے نام پر لاکھوں خواتین کو بیدردی کے ساتھ بازاروں اور سڑکوں پر گھسیٹا گیا اور نچلے درجے کے کام اس س کے سپرد کر دیئے گئے۔ آج امریکہ و یورپ کے اکثر ممالک کے ریستورانوں اور ہوٹلوں میں ویٹر سے لے کر روم اٹنڈینٹ اور خاکروب تک کی خدمات عورتوں کے

* Ph.D Scholar, Department of Comparative Religion & Islamic Culture, University of Sindh, Jamshoro.
** Assistant Professor, Department of Comparative Religion & Islamic Culture, University of Sindh, Jamshoro.

ISSN-Online: 2790-8828
ISSN-Print: 2790-881X

حوالے کر دی گئی ہیں۔ "گھر کی قید" سے باہر نکل کر ملنے والی یہ "آزادی" اس مغربی فکر و فلسفے کا نتیجہ ہے جس کے مطابق اگر کوئی خاتون اپنے گھر میں والدین، شوہر، اولاد اور بہن بھائیوں کے لیے امور خانہ داری سنبھالے تو اسے ذلت و قید سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر جب وہی خاتون اجنبی مردوں کی خدمت کرے، ان کے لئے کھانا بنائے، جہازوں اور ہوٹلوں میں میزبانی کرے، دکانوں اور دفاتر میں اپنی مسکراہٹوں سے گاہکوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرے تو اسے "اعزاز" اور "آزادی" سمجھا جاتا ہے۔[1] مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ

> "ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عورت کسب معاش کے آٹھ آٹھ گھنٹے کی یہ سخت اور ذلت آمیز ڈیوٹیاں ادا کرنے کے باوجود اپنے گھر کے کام دھندوں سے اب بھی فارغ نہیں ہوئی۔ گھر کی تمام خدمات آج بھی پہلے کی طرح اسی کے ذمے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اکثریت ان عورتوں کی ہے جنہیں آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینے کے بعد اپنے گھر پہنچ کر کھانا پکانے، برتن دھونے اور گھر کی صفائی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔"[2]

مغربی تصور حقوق نسواں نے مغربی عورت کو ایک طویل مدت تک دوڑانے کے بعد تھکا دیا ہے۔ حقوق نسواں کی تحریکوں کے نتیجے میں عورتوں کو ووٹ کا حق، آزادی، مساوات، معاشی تقویت اور جداگانہ شناخت تو مل گئی مگر اس کی نسوانیت اور خاندانی مقام ختم ہو گیا۔ اس بے لگام آزادی اور اختیار نے عورتوں کی مکمل زندگی کو نہ صرف ایک غلط رخ پر ڈال دیا ہے بلکہ شدید معاشرتی عدم توازن بھی پیدا کر دیا ہے بالخصوص مغربی معاشرے کی عورت تو سنگین مسائل سے دوچار ہے۔

مغربی معاشرے میں اثرات

مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرنے کے لیے سب سے پہلے یورپی خواتین آگے بڑھی تھیں جس کی وجہ سے یورپ معاشرے کو معاشرتی انارکی، فکری بے راہ روی، اخلاقی تنزلی اور خاندانی ریزہ ریزی حاصل ہوئی۔ جب اس فکر نے یورپ سے نکل کر امریکی معاشرے میں سرایت کیا تو اس کا نتیجہ کروڑوں مجہول النسب بچوں کی صورت میں نکلا جن کی ریاست کے زیر سایہ پرورش نے امریکی معاشرے کو اقتصادی و معاشی زبوں حالی میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ ایسے بچوں پر اوسطاً فی بچہ اٹھارہ ہزار ڈالر سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔[3] امریکی معاشرے میں اس طرح کے بچے کم از کم تیس فیصد ہیں جن کی پیدائش غیر قانونی ہے جب کہ فرانس و برطانیہ میں یہ صورت حال اس قدر ہولناک ہو چکی ہے کہ فرانسیسی معاشرے کا ہر پانچواں بچہ اور برطانوی معاشرے کا ہر چوتھا بچہ مجہول النسب ہے۔[4] دوسری طرف طلاق کی تیزی سے بڑھتی شرح نے بھی معیشت کو دھچکا پہنچایا ہے کیونکہ طلاق یافتہ اور غیر ملازمت پیشہ عورتوں کی کفالت بھی ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ امریکہ و یورپ میں ہر سال لاکھوں آپریشن صرف حمل ضائع کرنے کے لئے کیے جاتے ہیں جب کہ مانع حمل ادویات اور دیگر وسائل بھی عام دستیاب ہیں۔ معاشرے کے لوگوں کی جنسی ہوس اور بھوک کا یہ عالم ہے کہ جانوروں اور چھوٹی معصوم بچیوں تک کو نہیں بخشتے ہیں۔ جنسی بے راہ روی اور عصمت سوزی حدود سے متجاوز ہو چکی ہے۔[5] اس ضمن میں مولانا وحید الدین لکھتے ہیں کہ

"یورپ میں عورت کو مرد کے مساوی لانے کے لئے گھر سے نکالا گیا۔ اس سے یہ تو نہیں ہوا کہ عورت فی الواقع مرد کے مساوی ہو جاتی، البتہ اس کو زندگی کے ہر موڑ پر مردوں کے ساتھ کھڑا کرنے کا یہ انجام ہوا کہ فواحش کا سیلاب امنڈ آیا۔"[٦]

پاکستانی عورت کی نسوانیت سے محرومی

حقوق نسواں کی تحریکوں نے مغربی و مشرقی عورتوں کو جو آزادیاں اور مراعات دی ہیں، ان کی وجہ سے عورتوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ آزادی کے نتیجے میں عورت نے نہ صرف اپنا تشخص گم کر دیا ہے بلکہ نسوانیت نام کا وہ انمول زیور بھی کھو دیا ہے جو فطرت نے عورت کو اعزازی طور پر تفویض کیا تھا۔ مغربی عورت کی نقالی میں جب مشرقی عورت نے گھر کی پاکیزہ فضا سے قدم باہر نکالا تو دفتر، بازار اور جنسی ہوس ناکی کی منڈیوں نے اس عورت کو خوار کرتے ہوئے اس کے جمال پرور چہرے پر زمانے کی دھول پھینک دی۔ چنانچہ معاشی و اقتصادی ترقی کی دوڑ میں گھر سے نکلنے والی عورت نے مشرقی معاشرے کے اخلاقی نظام کو خود منہدم کر دیا۔ کچھ عرصہ قبل پاکستانی معاشرے میں کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ شریف اور معزز گھرانوں کی لڑکیاں رات کے اوقات میں سپر اسٹورز، کلینک اور ہسپتالوں کے دورے کر کے ڈاکٹروں کی توجہ اور میڈیکل اسٹوروں اور فارمیسیوں سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ادویات کے آرڈرز لیتی پھریں گے اور رات گئے تک گھروں پر لوٹیں گی۔ پاکستان کے غریب اور پس ماندہ گھرانوں کی نوجوان لڑکیاں معروف فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس پر ویٹر کے طور پر ملازمت کرتی اور مردوں کی خدمت کرتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں عموماً مشرقی لباس بھی نہیں پہنتی ہیں بلکہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ہو کر اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتی ہیں۔ مغربی تہذیب کے تصور حقوق نسواں سے قبل ان مشرقی و پاکستانی گھرانوں میں یہ عالم ہوا کرتا تھا کہ اگر سر سے ڈوپٹہ سرک جاتا تو گھر کے بڑے فوراً توجہ دلایا کرتے تھے مگر اب سر کھولنا اور مغربی لباس پہن کر باہر گھومنا عام ہو گیا ہے۔[٧] ان لڑکیوں کے اجداد نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا ہو گا کہ ان کے گھروں کی بچیاں اس قسم کا لباس زیب تن کریں گی مگر مغربی تصورات کے باعث اس تبدیلی کو پاکستانی معاشرہ قبول کر رہا ہے۔ مختلف کمپنیاں تو اپنی اشتہاری مہم کے لئے ملازم خواتین سے ایسا کام لیتی ہیں کہ انسانیت شرما جائے۔[٨]

اشتہاری کمپنیوں نے آج کی عورت کو اشتہارات کا لازمی حصہ بنا کر اس کی حالت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ اسے نیم برہنہ ہی کر دیا ہے۔ عورت کا جسم دکھا کر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی مصنوعات فروخت کرتی ہیں اور اس عمل کو مارکیٹنگ کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ منیر احمد خلیلی لکھتے ہیں کہ

"مغربی تہذیبی یلغار نے جب مسلم ملت کے معاشرتی حصار میں سے شرم و حیا کی اینٹ کھینچ لی اور مسلمان عورت کو اپنے مخصوص وظائف حیات سے غافل کر کے چادر اور چار دیواری سے باہر نکال دیا تو اخلاقی قدروں اور ایمانی دولت کے بچاؤ کی کوئی اور صورت باقی نہ بچی کیونکہ اسلامی روایات و اقدار کی حفاظت کی آخری محافظ خاتون خانہ ہی ہوتی ہے۔"[٩]

متوسط طبقے سے تعلق رکھنی والی لڑکیاں جب کسی فرم یا کمپنی میں ملازمت کرتیں اور مخلوط ماحول سے جڑتی ہیں تو ان کے متعدد اجنبی افراد سے تعلق، بات چیت اور مانوسیت ہو جاتی ہے۔ اولا اس طرز عمل کو بھی معیوب سمجھا جاتا تھا مگر اب یہ بھی پاکستانی معاشرے میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ محمد قطب نے اس صورت حال کا تجزیہ کچھ ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ

> "بے چاری عورت اپنے بے رحم جذبات و خواہشات کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی ہے۔ ایک طرف روزی کمانے کی فکر، دوسری طرف جنسی آسودگی اور پھر قیمتی ملبوسات اور بناؤ سنگھار کی شدید خواہش۔ ان سب سے مغلوب ہو کر وہ ایک مخصوص ڈگر پر چل پڑی ہے۔ عورت کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ مردوں کا دل لبھائے، کارخانوں اور دکانوں میں ملازمت کرے۔ اس کے پاس جوں جوں سامان تعیش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اسی قدر ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کارخانہ داروں نے عورت کے ارمانوں اور خواہشوں کو بھانپ کر اس کی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ عورت کو کم سے کم معاوضہ دیا۔ یوں عورت کچھ اپنی مجبوری اور کچھ نادانی کے باعث ظلم و استحصال کی چکی میں پستی رہی۔"[۱۰]

موجودہ معاشرہ ایسے راستے پر چل نکلا ہے جہاں جابجا جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے کا سامان موجود ہے۔ گھر سے قدم باہر نکالیں تو مختلف اشتہارات، سائن بورڈز اور بینرز پر عورتوں کی اخلاق باختہ تصاویر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کتابوں کی دکانوں اور اسٹالز پر ایسے رسائل و جرائد بکثرت موجود ہوں گے جن کا مقصد ہی فحاشی کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ ٹی وی اور انٹرنیٹ پر بھی یہی کچھ نظر آتا ہے یہاں تک کہ فیس بک یا تعلیمی مقصد کے لیے کھولی جانے والی ویب سائٹس پر بھی عریاں تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ اس طرح کے ماحول نے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں جنون اور جنسی ہیجان برپا کر دیا ہے جس کے نتیجے میں لوگوں نے تسکین کے لیے غیر قانونی اور غیر فطری راستے تلاش کرنے شروع کر دیئے ہیں۔"

پاکستان میں مخلوط ماحول کے اثرات

مغربی تصورات کے نتیجے میں پاکستانی خواتین کو ایک مخلوط نظام میں رہتے ہوئے اسکول، کالجز، دفاتر اور کاروباری مراکز میں کام کرنا پڑتا ہے اور مغربی تہذیب کی یہ ناگزیر خرابی پوری طرح پاکستانی معاشرے میں سرایت کر چکی ہے۔ اس فکر کے جو نتائج مغربی معاشرے میں ظاہر ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ امریکہ میں چودہ برس سے کم عمر دس لڑکیوں میں سے نو بچیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی دوستوں میں اپنے جسمانی تعلقات کا ذکر فخریہ انداز میں کرتی ہیں جب کہ ان دس میں سے ایک بچی محض اس لیے محفوظ ہوتی ہے کہ اسے جسمانی تعلقات قائم کرنے کے لئے کوئی مناسب ساتھی نہیں ملا ہوتا ہے۔

پاکستان میں بچیوں کی تعلیم کے نام پر بچیوں کو لڑکوں کے پرائمری اسکولوں میں داخلے دے کر بچپن سے ہی اختلاط کے ماحول کا عادی بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے چنانچہ اس کا نتیجہ سامنے آنا شروع ہو گیا ہے کہ فواحش کا نہ رکنے والا سیلاب پھوٹ پڑا اور عیش پرستی اور شہوانیت

نے پوری قوم کو شدید متاثر کیا ہے۔ مشرقی عورت نے جب گھر کی چار دیواری سے قدم نکالا اور محفل و مجلس کی رونق بنی تو پھر معاشرہ بے راہ روی میں مبتلا ہو گیا۔ دوسری طرف میڈیا نے کسبیوں اور طوائفوں کا نام "آرٹسٹ" رکھ دیا تا کہ ضمیر کو ملامت کرنے والی اندرونی خلش کو دبایا جا سکے۔[۱۲]

پاکستان میں مخلوط تعلیمی اداروں کے نقصانات

مخلوط تعلیمی اداروں کی بدولت لڑکے اور لڑکیاں ایک کلاس میں اور ساتھ ساتھ نشست گاہوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ صرف تعلیمی سرگرمیوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ معاملہ آگے بڑھ کر گفت و شنید، پھر بوس و کنار، ہم آغوشی اور بالآخر گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح کے معاملات اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی حد تک محدود نہیں بلکہ ان کا سلسلہ شہری پارکوں اور عوامی مقامات تک وسیع ہو گیا ہے۔[۱۳] ایک امریکی مفکر اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ

> "مخلوط تعلیم میں لڑکے اور لڑکیاں جلد بالغ ہو جاتے ہیں۔ اس پر مستزاد کہ بلوغت کے وقت لڑکوں کے جسم میں مردانہ ہارمونز عام حالات کے مقابلے میں دس سے بیس گنا زیادہ پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ شدید نفسیاتی اور جنسی ہیجان کا شکار ہوتے ہیں۔ لڑکیوں میں زنانہ ہارمونز کی وجہ سے بلوغت کے دور میں سستی اور ڈپریشن عام ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں ان کی اکثریت جنس مخالف کے متعلق ہی سوچتی ہے۔"[۱۴]

میڈیا کے اثرات

مغربی تصور حقوق نسواں کے باعث مغربی عورت کے بعد اب مشرقی عورت کا میڈیا میں بدترین استحصال کیا جا رہا ہے۔ میڈیا کی ہر چھوٹی بڑی سرگرمی عورت کی تصویر و تشہیر کے بغیر ادھوری ہے۔ میڈیا ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا جس میں عورت کو شوپیس بنا کر پیش نہ کیا جائے۔ ملک پاکستان کے طول و عرض میں، ہر چھوٹے بڑے شہر و قصبے میں سائن بورڈرز، سینما ہال، اخبارات، رسائل و جرائد سمیت ہر شے میں عورت کی تصویر مصنوعات بیچنے کے لئے استعمال کی جا رہی ہے۔ تھر کے علاقے کا شمار پاکستان کے پس ماندہ ترین علاقوں میں ہوتا ہے جہاں لوگوں کو پینے کے لئے صاف پانی تو کجا گندا پانی بھی میسر نہیں مگر اس کے باوجود وہاں بھی سائن بورڈز پر مشروبات کے اشتہارات ہر عورت کی تصویر بنی ہوتی ہے اور پورے میڈیا کی چمک دمک بے پردہ اور نیم عریاں عورتوں کے گرد گھوم رہی ہے۔[۱۵]

پاکستان میں خاندانی نظام کی بربادی

اسلام نے گھریلو امور کی ساری ذمہ داری خواتین کو دی ہے مگر مغربی تصورِ حقوقِ نسواں کے نتیجے میں مشرقی خواتین نے گھریلو ذمہ داریوں پر کم اور بیرونی سرگرمیوں پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی ہے اور بعض عورتوں نے تو یہ گمان کر لیا ہے کہ بیرونی فرائض سرانجام دینے کی وجہ سے اب یہ لازم ہی نہیں کہ وہ امور خانہ داری بھی پورے کریں مگر اس فکر کا نتیجہ گھریلو فساد و انتشار کی صورت میں نکلتا ہے۔ مغربی افکار کی

یلغار سے قبل پاکستانی لڑکیوں کی تربیت انداز سے کی جاتی تھی کہ وہ گھریلو معاملات کو حسن خوبی سے سرانجام دے سکیں کیونکہ شادی کے بعد لڑکیوں کا سامنا ایک یکسر مختلف ماحول سے ہوتا ہے مگر مغربی فکر کے نتیجے میں گھریلو تربیت سے خالی لڑکیوں کے لیے سسرال کی حیثیت ایک ذہنی وجذباتی اذیت گاہ کے طور پر بن گئی ہے۔ بہت سے گھرانے ایسے بھی ہیں جہاں ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی میاں بیوی اجنبیوں کی طرح رہتے ہیں۔ یہ مسائل اس وقت پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں جب ایک عورت خود کو مذہب و فطرت کی قید سے آزاد کر کے اور اپنے فطری مقاصد کو فراموش کرتے ہوئے گھر کی دہلیز سے قدم باہر نکالتی ہے۔[۱۶] اس ضمن میں ماہرین لکھتے ہیں کہ

> "آزادی اور ملازمت کا شوق آج عورت کو اس کے اصل مرکز عمل اور حقیقی کارگاہ حیات یعنی اد کے گھر سے باہر نکال کر لے آیا ہے۔ یہ خود عورت کے لیے اور مجموعی طور پر مسلم معاشرے وملت کے لیے بڑا گھمبیر مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ عورت پلٹ کر اپنی قلمرو میں آجائے اور باہر کے مسائل مرد پر چھوڑ دے۔ ناگزیر حالات کے سوا گھر سے باہر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز نہ بنائے۔ اپنی نسلوں کو چند ٹکوں کی بھینٹ نہ چڑھائے۔ اس طرح سے آئندہ نسل ضائع ہو رہی ہے اور خاندانی نظام کا استحکام متزلزل ہو رہا ہے۔"[۱۷]

حقوق نسواں کی دوڑ میں لگ کر عورتوں نے بچوں کی پرورش چھوڑ کر ملازمتیں کرنا شروع کر دی ہیں جس کی وجہ سے ماں کی گود کی جگہ ڈے کیئر سینٹروں نے لے لی ہے جب کہ یہ بات تحقیق سے ثابت شدہ ہے کہ نرسریوں اور ڈے کیئر سینٹر میں پلنے والے بچے طرح طرح کے نفسیاتی مسائل اور نقائص میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح کے ادارے ان بچوں کی جذباتی ونفسیاتی ضرورتوں کی تکمیل کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ ادارے ان بچوں کی تربیت محبت و نرمی سے کرنے کے بجائے اس طرح سے کرتی ہیں کہ جیسے یہ بچے انسان نہیں بلکہ احساس و شعور سے خالی مشینیں ہوں۔[۱۸]

پاکستانی خواتین اور عدم تحفظ

تحریک حقوق نسواں کے عالمگیر اثرات کے باوجود باوجود ترقی پذیر معاشروں کی اکثر عورتوں کو ملازمت کے سلسلے میں اپنی محنت کا ساٹھ فیصد حصہ بھی نہیں مل پاتا ہے۔ ایک تحقیقی دستاویز کے مطابق صرف ایشیا میں سینتیس کروڑ دیہاتی عورتیں خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہیں جب کہ پوری دنیا میں رات کو بھوکا سونے والے افراد کی تعداد ساٹھ کروڑ کے قریب ہے جن میں مردوں کی نسبت خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ دوسری طرف خواتین کے مسائل میں سے اہم ترین مسئلہ عدم تحفظ کا ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق جنوبی ایشیا کے خطے میں سب سے زیادہ اجتماعی زیادتی کے واقعات ہوتے ہیں اور تھائی لینڈ وفلپائن میں تو پانچ لاکھ طوائفیں ایسی بھی ہیں جو کم عمر بچیاں ہیں اور ان کی عمر سولہ سال سے بھی کم ہے۔[۱۹]

پاکستانی خواتین پر گھریلو تشدد

حقوق نسواں کی فکر کے عملی نفاذ نے عورتوں کو ایک بڑا نقصان یہ بھی پہنچایا ہے کہ خود کو بااختیار سمجھنے والی خواتین کے ساتھ مرد کبھی کسی موقع پر بھی ہمدردی کا اظہار نہیں کرتے ہیں۔ مرد خواہاں ہوتا ہے کہ عورت اس کے حکم کی تعمیل کرے مگر برسرروزگار خواتین کی اکثریت مرد کی حاکمیت و قوامیت تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسی عورتوں کو مرد جسمانی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں چنانچہ عورتوں پر ہونے والا یہ تشدد پوری دنیا کی عورتوں کے لیے ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے۔ اس حوالے سے امت الرحمن لکھتی ہیں کہ

"اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے عورتوں کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی پھر بھی پاکستان میں عورتوں پر تشدد کے واقعات ان گنت ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں ۷۳۶ کیسز عورتوں پر جسمانی تشدد کے، جبکہ ۶۰۰ واقعات جنسی تشدد کے اور ۴۹۰ واقعات بچوں، لڑکیوں اور لڑکوں پر تشدد کے ریکارڈ ہوئے۔ ۵۴۰ واقعات خودکشی سے عورتوں کی اموات کے، ۸۰ واقعات کاروکاری کے ریکارڈ ہوئے۔ عورتوں کے اغواء کے ۴۸۲ واقعات، عورتوں کے جلنے سے اموات واقع ہونے کے ۱۶۰ کیسز ریکارڈ ہوئے۔ ۲۰۰۰ء میں سندھ میں ۸۶ کیسز عورتوں کے اغواء کے، پنجاب میں ۸۰، بلوچستان میں ۸، خیبر پختونخواہ میں ۶ اور اسلام آباد میں ۴ کیسز ریکارڈ ہوئے۔ LAHRA کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۲ء میں خواتین پر تشدد کے ۷۳۶ کیسز ریکارڈ ہوئے اور ۴۸۲ خواتین اغواء کی گئیں۔"[۲۰]

خواتین کے معاشی مسائل

حقوق نسواں کے نام پر خواتین کی محرومیوں اور بے بسی میں ہزار گنا اضافہ ہو چکا ہے اور عورت کی ترقی و خوشحالی کے خوش کن نعروں کے ساتھ عورت سے ملازمت کے نام پر دو تین گنا زیادہ خدمت لینے کے باوجود اس کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ جب عورتوں نے حقوق نسواں کے نام پر مردوں کی جگہ سنبھالی تو دوسری طرف مرد نہ صرف اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گیا بلکہ اس نے گھریلو امور میں عورت کا ہاتھ بٹانے سے بھی انکار کر دیا۔ ملازمت پیشہ عورت خواہ بارہ سے پندرہ گھنٹے کی ڈیوٹی کرے مگر اس کے باوجود اسے گھر آکر سارے کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔ منیر احمد خلیلی اس متعلق لکھتے ہیں کہ

"اس انقلاب میں سب سے زیادہ مظلوم ہستی عورت کی ہے۔ اس کو اب پہلے سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ نہ نفسیاتی طور پر آسودہ خاطر ہے اور نہ مادی لحاظ سے خوشحال۔ مرد نے نہ صرف یہ کہ عورت کا مادی سہارا بننے سے انکار کر دیا بلکہ اپنی روزی آپ کمانے کی ذمہ داری الٹا عورت کے سر پر ڈال دی۔ خاوند، باپ، یا بیٹے کی حیثیت میں

مرد کی سنگ دلی کا یہ ایک پہلو تھا۔ صنعت کار کے روپ میں مرد اور زیادہ سفاک بن کر عورت سے پیش آیا۔ عورت کو اس نے اپنی ناانصافیوں کا نشانہ بنایا۔"[21]

اس مجرمانہ معاشرتی رویے کے متعلق محمد قطب لکھتے ہیں کہ

"انقلاب نسواں میں سب سے مظلوم ہستی عورت ہے۔ اس کو اب پہلے سے کہیں زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود نہ وہ نفسیاتی طور پر آسودہ ہے نہ مادی لحاظ سے خوشحال۔ مرد نے نہ صرف یہ کہ عورت کا خواہ وہ اس کی بیوی تھی یا ماں، مالی سہارا بننے سے انکار کر دیا بلکہ اپنی روزی کمانے کی ذمہ داری اس کے سر ڈال دی ہے۔ اس طرح وہ کارخانہ دار کی بے انصافیوں کا شکار بھی بنتی ہے، اس کو کام بھی زیادہ کرنا پڑتا ہے مگر معاوضہ مردوں سے کم ملتا ہے۔"[22]

خواتین کی نفسیاتی وجسمانی صحت پر اثرات

حقوق نسواں کی تحریک کی وجہ سے عورتوں کے کندھوں پر دہرا بوجھ آگیا ہے جس کا نتیجہ طرح طرح کے صحت و نفسیاتی مسائل کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ گھر کی دہلیز سے قدم باہر نکالنے کے بعد خواتین کو جس انتھک مشقت و محنت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا اثر ان کی جسمانی و نفسیاتی صحت پر پڑتا ہے۔ زراعت اور اس سے متعلقہ شعبوں میں جو خواتین صبح سے شام تک محنت و مشقت کرتی ہیں ان کی اجرت مردوں کے مقابلے میں نصف دی جاتی ہے۔ زیادہ محنت پر کم اجرت ملنے کے سبب سے بہت سی خواتین مطمئن نہیں ہوتیں اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جاتی ہیں کیونکہ کم مزدوری کی وجہ سے وہ اپنے گھریلو اخراجات پورے نہیں کر سکتی ہیں چنانچہ ایسی خواتین اپنی خوراک کم کر دیتی ہیں جس کی وجہ سے وہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر امت الرحمن لکھتی ہیں کہ

"سارا دن کام کرنے کے باوجود انہیں کسی قسم کی سہولیات بھی فراہم نہیں کی جاتیں۔ کئی میل کا سفر پیدل طے کر کے وہ اپنے کام کی جگہ پر پہنچتی ہیں، جس کی بدولت کام سے پہلے ہی وہ تھکاوٹ محسوس کرتی ہیں۔ ان کے لیے کسی بھی سہولت کا انتظام نہیں کیا جاتا اور انہیں اسی مزدوری میں سے ذرائع آمدورفت کا انتظام کرنا پڑتا ہے جو ایک طرح سے مالی بوجھ ہے جس کا انتظام کرنا خواتین کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ سخت سردی ہو یا شدید گرمی، وہ حمل کی حالت میں ہوں یا حیض کی حالت میں، معاشی ایمپاورمنٹ کے حصول کی خاطر ان کو اپنی ڈیوٹی پورا وقت دینی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی صحت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں دوسری طرف کام کرنے کی جگہ خاص طور پر فیکٹروں میں جہاں زیادہ تر ورکرز خواتین ہی ہوتی ہیں ان کے لیے سہولیات کا انتظام نہیں ہوتا۔ کوئی مالی معاونت، نہ تربیتی پروگرام کا انتظام کیا جاتا ہے، نہ بریک دی جاتی ہے اور نہ ہی ان کی صحت کا خیال رکھتے

ہوئے کام کا دورانیہ کم کیا جاتا ہے' بلکہ وہی ۱۲ سے ۱۶ گھنٹے کے مسلسل کام کے بعد گھر جا کر پھر گھر کے کام بھی انہی خواتین کی ذمہ داری میں آتے ہیں۔ اس طرح ۲۴ گھنٹے کی مسلسل جدوجہد میں پڑنے والی خواتین کو اپنی صحت برقرار رکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔"[۲۳]

ملازمت کے دوران خواتین کو درپیش سب سے سنگین مسئلہ آمد و رفت کے ذرائع کا ہے۔ وہ خواتین جو مختلف اداروں، بنکوں، فرمز، ہسپتالوں، یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں ملازمت کرتی ہیں تو انہیں اپنے جائے ملازمت تک پہنچنے کے لئے متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سی خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں اپنے گھر تک جانے والی متعلقہ بس کے انتظار میں طویل وقت تک کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اگر وین یا بس آ بھی جائے تو اس میں بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں مل پاتی۔ اس کے علاوہ بس یا ویگن میں ہر طرح کے مردوں کی نگاہوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ سب رویے اور مسائل کا سامنا کرنا ایک عورت کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ان حالات کا متواتر سامنا عورتوں کو بیمار کر دیتا ہے جس کی وجہ سے ان کی ملازمت بھی متاثر ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری تندہی سے سر انجام دینے سے قاصر ہوتی ہیں۔ اس صورت حال کی منظر کشی کرتے ہوئے عامرہ احسان نے لکھا ہے کہ

"ملازمت پیشہ خاتون کہیں دفتروں میں خوار ہوتی ہے، کہیں سڑکوں پر بدنگاہی اور آوازیں کسے جانے کا سامنا کرتی ہے۔ کہیں بسوں، ویگنوں، رکشوں میں دھکے کھاتی ہے۔ جب گھر آتی ہے تو ترسے ہوئے بچے محبت اور توجہ کے طالب ہوتے ہیں۔ تھکا ہارا شوہر اجڑا بکھرا گھر دیکھ کر سر پھوڑنے کو دوڑتا ہے اور یہ بی بی اپنی تھکن سے چور ہڈیاں سمیٹ کر بستر پر جا گرتی ہے تو اگلے دن دفتر اور گھر کی دوہری ذمہ داری کے تفکرات اس کی نیند غارت کر دینے کو کافی ہوتے ہیں۔"[۲۴]

نتائج

- حقوق نسواں کے نام پر مشرق و مغرب کی عورت پر دوگنا بوجھ ڈال دیا گیا ہے جس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ عورت کو اس کی نسوانیت سے ہی محروم کر دیا جائے۔
- اس تحریک کے نفاذ کے نتیجے میں مردوں کی بڑی تعداد خواتین کی معاشی کفالت سے فرار ہو گئی ہے۔
- حقوق نسواں کی تحریک کے ذریعے پاکستانی معاشرے میں مرد و زن کے اختلاط اور مخلوط ماحول کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔
- ملازمت پیشہ ماؤں کی گھر میں عدم موجودگی کی وجہ سے عورتوں کو بہت سے نفسیاتی و جسمانی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

سفارشات

- حقوق نسواں کے حوالے سے بین الاقوامی و قومی سطح پر جو سفارشات بھی مرتب کی جائیں، ان کی بنیاد لازمی طور پر قرآن و سنت ہونی چاہیے۔
- خواتین کی ترقی اور ان کے حقوق کے حصول کے لئے حکومتی سطح پر سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔
- اسلام کے پیش کردہ کفالت کے نظام کے ذریعے خواتین کو فکر معاش سے آزاد کیا جائے۔
- ملازمت کی جگہوں پر خواتین کو ہراساں کرنے کے خاتمے کے حوالے سے کوئی پالیسی بنائی جائے۔

حواشی وحوالہ جات

---

[۱] مفتی محمد تقی عثمانی، "آزادی نسواں کا فریب، "ماہنامہ محدث (لاہور، ۲۰۰۴)، ص ۱۰۴.

[۲] ایضاً

[3] "ILLEGITIMACY IN THE UNITED STATES" *Journal of the American Medical Association* 113, no. 14 (September 30, 1939): 1329.

[۴] جیفا جواد، جدید تحریک نسواں اور اسلام، مترجم: خورشید احمد ندیم (اسلام آباد: معاصر اسلامی فکر، ادارہ برائے تعلیم و تحقیق، ۲۰۰۰)، ص ۹۸.

[۵] ایضاً

[۶] مولانا وحید الدین خان، خاتونِ اسلام (لاہور: دار التذکیر، ۲۰۰۶)، ص ۸۲، ۸۱.

[۷] ڈاکٹر محمد عاشق خان، معاشی ترقی میں عورت کا موجودہ کردار (دہلی: نظامیہ پبلیکیشنز، ۲۰۰۶)، ص ۲۶.

[۸] ارشد احمد بیگ، "عورت اور میڈیا، "ترجمان القرآن (لاہور، ۲۰۱۲)، تلخیص.

[۹] منیر احمد خلیلی، عورت اور دورِ جدید (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۹۱)، ص ۵

[۱۰] سید قطب شہید، اسلام اور جدید جاہلیت (لاہور: البدر پبلی کیشنز، ۱۹۸۱)، ص ۸۴.

[۱۱] سعود الا عظمی، "صنف نازک پر بڑھتی ہوئی زیادتیاں، "ماہنامہ رفیق منزل، 2013، تلخیص.

[۱۲] انور اختر، پردہ اور جدید ریسرچ (کراچی: ادارہ اشاعت اسلام، ۲۰۰۳)، ص ۷۵.

[۱۳] مولوی نایاب حسن قاسمی، اسلام میں تعلیم نسواں اور موجودہ مخلوط نظام تعلیم، ماہنامہ دار العلوم، جلد 96 (دیوبند: شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند، ۲۰۱۲)، تلخیص.

[۱۴] "مخلوط تعلیم کا زہر، "ماہنامہ افکار معلم، 2007، تلخیص.

[۱۵] اختر، پردہ اور جدید ریسرچ، ص ۳۰۹.

[۱۶] سید مظہر علی ادیب، خاتون خانہ (رامپور: مکتبہ ذکریٰ، ۲۰۰۹)، ص ۹۱.

[۱۷] زینب الغزالی، مسلمان عورت کا اصل مسئلہ (راولپنڈی: حسن البناء اکیڈمی، ۱۹۸۶)، ص ۹.

[۱۸] محمد قطب، اسلام اور جدید مادی افکار، مترجم: سجاد احمد کاندھلوی (نئی دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۱۹۸۰)، ص ۷۴.

[19] امت الرحمن، "پاکستان میں عطائے اختیار خواتین: جدید تصورات اور اسلام" (لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۹)، ص ۲۲۸.

[۲۰] محولہ بالا، ص ۲۲۹

[۲۱] منیر احمد خلیلی، عورت اور دورِ جدید، ص ۱۳۹.

[22] سید قطب شہید، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات (لاہور: البدر پبلی کیشنز، س ن) ص ۱۷۱.

[23] الرحمن، "پاکستان میں عطائے اختیار خواتین: جدید تصورات اور اسلام"، ص ۲۴۴.

[24] عامرہ احسان، اکیسویں صدی اور مسلمان عورت (راولپنڈی: ادارہ عفت، ۲۰۱۰)، ص ۱۰۱.